محدثِ عصر مخدومنا حضرت مولانا محمد یونس صاحب

نور اللہ مرقدہ و نضر وجہہ

سابق شیخ الحدیث جامعہ مظاہر علوم، سہارنپور

بقلم: محمد معاویہ سعدی، تخصص فی الحدیث، جامعہ مظاہر علوم سہارنپور

حضرت مولانا سعادت علی صاحب فقیہِ سہارنپورؒ (ت: ۱۲۸۶ھ) کے دستِ مبارک سے جس ''عربی مدرسہ'' کی بنیاد ۱۲۸۳ھ، مطابق ۱۸۶۶ء میں انتہائی خاموشی، سادگی اور تواضع کے ساتھ رکھی گئی تھی، بانیوں کے اِخلاص وللہیت کی برکت، اور اپنی ہمہ جہت علمی، دینی، دعوتی اور عرفانی خدمات کے ذریعے وہ آج ''جامعہ مظاہر علوم سہارنپور'' کے نام سے ایک شہرۂ آفاق عالمی اسلامی درسگاہ اور ایک مرکزی ملی ادارہ ہے۔

بالخصوص حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری (ت: ۱۲۹۷ھ) محشّی بُخاری وترمذی ومشکوۃ، حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی (ت: ۱۳۰۲ھ) یکے از بانیانِ مدرسہ، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری (ت: ۱۳۴۶ھ) صاحب ''بذل المجہود شرح سنن ابی داود''، حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی (ت: ۱۳۳۴ھ) صاحب ''اَمالیٔ امامِ گنگوہی''، حضرت مولانا سید عبداللطیف صاحب پورقاضوی (ت: ۱۳۷۳ھ) اُستاذِ حدیث وناظم اعلیٰ مظاہر علوم، حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب کامل پوری (ت: ۱۳۸۵ھ) اُستاذِ حدیث وصدرالمدرسین، حضرت مولانا محمد اسعد اللہ صاحب (ت: ۱۳۹۹ھ) اُستاذِ حدیث وناظم جامعہ، اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب (ت: ۱۴۰۲ھ) صاحبِ ''اوجز المسالک'' و''تعلیقات'' ''اَمالیٔ اِمام گنگوہی'' (رحمہم اللہ رحمۃً واسعۃً) جیسی نابغۂ روزگار شخصیات کے ذریعے، فنِ حدیث شریف سے مختلف النوع وابستگی، اور تعلیم وتدریس، تصنیف وتالیف اور وعظ وتقریر کے ذریعے حدیث شریف کی متنوع خدمات ''مظاہر علوم'' کا وہ امتیازی وصف ہے، جو محتاجِ بیان نہیں۔

اِسی سلسلۃ الذہب کی ایک روشن اور تابناک کڑی ہمارے استاذ ومربی، مفید ومعلّم، محدث العصر، مخدومنا ومولانا شیخ محمد یونس صاحب نور اللہ مرقدہ وبرد مضجعہ کی ذاتِ گرامی بھی تھی، جو گذشتہ نصف صدی سے جامعہ مظاہر علوم کی ''دار الحدیث'' کے صدر نشین اور شیخ الحدیث کی حیثیت سے، تشنگانِ علوم ومعارف کو اپنے علوم وہبیہ وکسبیہ سے سیراب فرماتے ہوئے، ۱۶؍شوال ۱۴۳۸ھ، مطابق ۱۱؍جولائی ۲۰۱۷ء کو، وصال فرما کر اپنے محبوبِ حقیقی سے جا ملے: إنا للہ وإنا إلیہ راجعون، إن للہ ما أخذ ولہ ما أعطی، وکل شيء عندہ بأجل مسمی، فلنصبر ولنحتسب۔

آپ کی وفات سے دنیائے حدیث شریف میں جو علمی خلا ہوا ہے، اُس کی حسرت، اُس کا صدمہ اور اُس کا غم، کیا عرب، کیا عجم، ہر جگہ محسوس کیا گیا۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ اِس دور میں آپ کی ذات: علم حدیث کا ایک بحرِ ناپیدا کنار، اَسانید ومتون کی تحقیق کے سلسلے میں حرفِ آخر اور سند، بالخصوص معلقاتِ صحیح بخاری کے حل کے لیے یکتائے روزگار تھی۔

راقم کو ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۹۹۹ء میں ''صحیح'' بخاری، ''صحیح'' مسلم، ''موطأ'' محمد، اور ''مسلسلات'' آپ سے پڑھنے کا شرف حاصل ہے، جس میں بتوفیقہ تعالیٰ اکثر کتابوں کی عبارت خوانی بھی احقر ہی کے حصے میں آتی رہی جس کی برکت سے (باوجود اپنی نااہلی وناقدری کے) حضرت الاستاذ کے مخصوص فیضِ تربیت سے استفاضۂ ظاہری وباطنی کے کافی مواقع حاصل رہے، اگر توفیقِ الٰہی شاملِ حال رہی تو ان شاء اللہ کسی مناسبت سے حضرت سے متعلق اپنے ذاتی تاثرات، مشاہدات اور تجربات، اور آپ کے مخصوص علمی افادات بھی مرتب کر کے پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جائے گی، سرِدست آپ کے اِجمالی سوانحی حالات اور فکری رجحانات سے متعلق کچھ تفصیلات پر اکتفا کیا جاتا ہے، وباللہ التوفیق، وھو المستعان۔

ولادت وابتدائی مراحل:-

آپ کی ولادت باسعادت ۲۵؍رجب ۱۳۵۵ھ، ۲؍اکتوبر ۱۹۳۷ء بروز شنبہ صبح سات بجے، آبائی گاؤں چوکیہ (کوریثی) ضلع جونپور صوبہ یوپی میں ہوئی۔

علاقے کا ماحول مدارس کی قلت کی وجہ سے عموماً جہالت کا تھا، مگر بحیثیتِ مجموعی دینداری اور سادگی تھی، گھرانے کے لوگ بھی نیک اور دیندار تھے، ۵؍سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے والدہ محترمہ کا سایہ سر سے اٹھالیا، اس لیے باقی پرورش نانی جان کی زیرِ سرپرستی ہوئی (اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے، اور مغفرت فرمائے)۔

تعلیمی مراحل:-

اسی دور میں آپ نے قریب کے گاؤں کے ایک مکتب میں جانا شروع کردیا، مگر یہ تعلیمی سلسلہ کسی وجہ سے منقطع ہوگیا، پھر تقریباً ۱۳ سال کی عمر میں مدرسہ ضیاء العلوم، مانی کلاں، ضلع جونپور میں داخلہ لیا، اور فارسی سے لے کر مختصر المعانی، شرح وقایہ، اور نورالانوار تک وہیں تعلیم حاصل کی، وہاں آپ کے اساتذہ میں حضرت مولانا ضیاء الحق صاحبؒ مظاہری فیض آبادی اور حضرت مولانا عبدالحلیم صاحبؒ مظاہری فیض آبادی، ثم جونپوری (بانی مدرسہ ریاض العلوم، گوریني، جونپور) بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں، ان دونوں ہی حضرات (خصوصاً اول الذکر) کا تذکرہ آپ کے درس میں بکثرت ہوتا، اور بہت لطف لے لے کر اپنے اس ابتدائی مدرسے اور وہاں کے مخلص اساتذہ کا ذکرِ خیر فرماتے۔

اِسی درمیان فتحپور تال نرجا (مئو، اعظم گڈھ)، مصلح الامۃ حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے مدرسہ میں بھی پڑھنے گئے تھے، مگر اَمراض کے تسلسل کی بنا پر، حضرتؒ نے برائے علاج واپس فرمادیا تھا۔

شوال ۱۳۷۷ھ میں آپ تکمیلِ درسیات کے لیے مدرسہ مظاہر علوم تشریف لائے، اور امتحانِ داخلہ میں کامیاب ہوکر، جلالین شریف کی جماعت میں شریک ہوئے، ۱۳۸۰ھ میں دورۂ حدیث شریف کے سالانہ امتحان میں اول نمبرات سے کامیاب ہوئے۔

اگلے سال تکمیلات کے طور پر مختلف علوم وفنون کی متعدد کتابیں: ہدایہ رابع، صدرا، شمس بازغہ، اقلیدس، خلاصۃ الحساب، درمختار وغیرہ پڑھیں۔

جامعہ مظاہر علوم میں آپ کے خصوصی اساتذہ میں: شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب، شیخِ مسلم حضرت مولانا منظور احمد خاں صاحب، ناظمِ مدرسہ حضرت مولانا محمد اسعد اللہ صاحب، حضرت مولانا امیر احمد صاحب، حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب اور حضرت مولانا وقار احمد صاحب رحمہم اللہ کی شخصیات کا نام زیادہ نمایاں ہے۔

اور رفقائے درس میں: حضرت مولانا محمد عاقل صاحب مدظلہ (صدر المدرسین، وموجودہ شیخ الحدیث مظاہر علوم)، حضرت مولانا عبدالرشید صاحب بستویؒ (سابق استاذِ حدیث مدرسہ ریاض العلوم، گوریني)، اور مولانا اجتباء الحسن کاندھلویؒ وغیرہم بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

ابتلاء وآزمائش:-

بچپن ہی سے متعدد بیماریوں میں مبتلا رہے، جس کی بناء پر تعلیمی سلسلہ میں بھی انقطاع ہوتا رہا، اور جب مظاہر علوم تشریف لائے تو بخار وغیرہ اَعذار اس حد تک بڑھ گئے کہ خون کی قے ہونے لگی، حضراتِ

اساتذہ نے وطن جانے پر اصرار کیا، تو آپ نے بصد ادب یہ پر عزیمت جواب دیا کہ ''میرے لیے یہاں مرنا گھر پر مرنے سے بہتر ہے، جو بات کان میں پڑے گی وہ دل میں اتر ہی جائے گی''۔

ایک مرتبہ حضرت الاستاذ نے درسِ بخاری کے دوران انتہائی جذباتی لہجے میں فرمایا کہ ''بچپن میں میری کاپی پر خالہ نے یہ شعر لکھ دیا تھا:

ہمیں دنیا سے کیا مطلب؟ مدرسہ ہے وطن اپنا　　مریں گے ہم کتابوں پر، ورق ہوگا کفن اپنا

بس یہی ہوا، اللہ تعالیٰ نے تقدیر خالہ جان کے ہاتھوں لکھوادی''۔

تدریسی دور:-

شوال ۱۳۸۲ھ میں معین مدرس کی حیثیت سے مظاہر علوم ہی میں تقرر ہوگیا، اور شرح وقایہ، قطبی، اور سلم العلوم آپ سے متعلق کی گئی۔

۱۳۸۳ھ میں مقامات و قطبی، اور ۱۳۸۴ھ میں ہدایہ اولین، اصول الشاشی جیسی کتابیں زیر تدریس رہیں۔

اسی سال حضرت مولانا امیر احمد صاحبؒ کے انتقال کی وجہ سے اسباق میں تبدیلی ہوئی، اور حضرت مفتی مظفر حسین صاحبؒ کی مشکوۃ شریف کا درس منتقل ہو کر آپ کو دے دیا گیا۔

۱۳۸۵ھ میں مختصر المعانی، قطبی، شرح وقایہ، مشکوۃ شریف پڑھائی۔

۱۳۸۶ھ میں نور الانوار اور اس کے ساتھ ابوداود اور نسائی کے اسباق بھی آپ سے متعلق ہوگئے۔

۱۳۸۷ھ میں مسلم، نسائی، ابن ماجہ اور موطئین زیر درس رہیں۔

۱۳۸۸ھ میں مسلم شریف، اور ہدایہ ثالث کے ساتھ بخاری شریف کا درس بھی آپ سے متعلق کردیا گیا۔

اُس وقت سے ۱۴۳۸ھ تک مسلسل پچاس سال آپ کے درسِ بخاری شریف کا فیض جاری رہا، جس میں ہندو بیرون ہند کے ہزارہا ہزار علماء و طلبہ آپ کے چشمۂ فیض سے مستفید و مستفیض ہوئے، اللہ تعالیٰ ان خدمات کو شرفِ قبول عطا فرمائیں، اور مظاہر علوم کے اِس سلسلۂ خدمتِ حدیث کو آپ کے بعد بھی قائم و دائم رکھیں، آمین۔

بیعت و سلوک:-

رمضان ۱۳۸۶ھ میں بیعت ہونے اور راہِ سلوک طے کرنے کا داعیہ پیدا ہوا، تو اپنے استاذِ گرامی

حضرت شیخ الحدیث صاحب نوراللہ مرقدہ سے درخواست کی، حضرت نے فرمایا: اِستخارہ کرلو، پھر کچھ دنوں بعد بیعت فرمالیا۔

محرم ۱۳۹۶ھ میں حضرت اَقدس ناظم صاحبؒ (مولانا محمد اسعداللہ صاحب) نے اِجازت بیعت عطا فرمائی، اوراسی سال رمضان میں حضرت شیخ نے بھی خلعتِ خلافت عطا فرمائی۔

ابتدا ہی سے اصلاح وتزکیہ کے سلسلے میں آپ کی طرف رجوع رہا، اولاً صرف علماء، طلبہ اور خواص ہی کی مراجعت تھی، پھر آہستہ آہستہ عوام الناس کا بھی رجوع بڑھنے لگا، آخر آخر میں آپ کی ذات والا صفات مرجع الخلائق ہوگئی تھی، اور فجر بعد کے ذکر، اورعصر بعد کے افادات کی مجالس میں عوام وخواص کا اچھا خاصا مجمع ہوجاتا تھا۔

علمی ذوق:-

۱-: اللہ تعالیٰ نے آپ کو وسعتِ نظری، ژرف نگاہی اور کمال درجہ کی نکتہ رسی کے باوصف، بے مثال قوت حافظہ، اورفہم ثاقب سے بھی نوازا تھا، جس کی بنا پر جواں عمری ہی سے آپ کی ذات کو علمی مرجعیت حاصل ہوگئی تھی، یہاں تک کہ آپ کے اساتذہ میں حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ اور حضرت ناظم صاحبؒ بھی حوالوں کی تلاش وتحقیق اورحدیث شریف کی تفتیش وتخریج کے سلسلے میں آپ سے مراجعت فرماتے، اوراکابرِ وقت میں حضرت مولانا سیدابوالحسن علی میاں ندویؒ، حضرت مولانا عبدالحلیم جونپوریؒ، محدث وقت حضرت مولانا عبدالجبار اعظمیؒ، حضرت مولانا شاہ ابرارالحق ہردوئیؒ وغیرہ حضرات علمی اشکالات اور تحقیقی مشکلات کے لیے آپ سے رجوع فرماتے۔

آپ کے علمی، تحقیقی، فقہی اورحدیثی اِفادات پر مشتمل ''الیواقیت الغالیۃ''، ''نوادرالحدیث'' اور ''نوادرالفقہ'' وغیرہ مجموعے آپ کی اس خصوصیت اورخداداد کمال پر شاہد عدل ہیں۔

۲-: عام طور پر حضرت الاستاذ قدس سرہ کی تحقیق ومطالعہ کی جولان گاہ حدیث شریف اوراس کے متعلقات تھے، مگر مختلف مناسبتوں سے دیگر علوم وفنون کی طرف توجہ، اورمتعلقہ کتابوں اورمصادر سے مراجعت کی بھی نوبت آتی رہتی۔

۳-: حضرت کا خاص علمی ذوق یہ تھا کہ تفسیری، حدیثی، فقہی، احسانی اوردیگر (متعلقہ) علوم وفنون کی تحقیق ومطالعے میں ہر ہر مسئلے اورجزیئے کے لیے اصل مراجع تک پہنچنے کا خاص اہتمام فرماتے، بعض مرتبہ کسی حوالے کی تلاش کے لیے کافی کافی وقت، اورکئی کئی دن تلاش وتتبع میں لگے رہتے، کبھی اپنے تلامذہ کو بھی شریکِ جستجو فرمالیتے، بعض وقت تو اس کے لیے سفر کی بھی نوبت آتی تو پیسے خرچ کرکے کسی ذریعے سے مطلوبہ کتاب

حاصل کرتے ،اور بعد از استفادہ واپس فرما دیتے۔

اسی ذوقِ تحقیق کی بنا پر آپ کے ذاتی کتب خانہ میں :متونِ حدیث، شروحِ حدیث، اصولِ حدیث، عللِ حدیث، رجالِ حدیث، پھر تفسیر، اصولِ تفسیر، فقہ (ائمہ اربعہ اور اہلِ ظاہر)، اصولِ فقہ، سیرت، نحو، صرف، لغت، ادب، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ علوم وفنون کی ایسی اور اتنی کتابیں جمع ہوگئیں، کہ ذاتی کتب خانے کی حیثیت سے آپ کے کتب خانے کو دنیا کے چند ممتاز کتب خانوں میں شمار کیا جاسکتا ہے، اور برصغیر کی حد تک تو غالباً سرفہرست رکھا جاسکتا ہے۔

۴-:حدیث شریف کا درس: شرحِ حدیث، ائمہ اربعہ اور دیگر ائمہ کے اقوال، دلائل، مقارنہ بین المذاہب، اور وجوہِ ترجیح وغیرہ کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہوتا، بخاری شریف تو بطور خاص ''ترجمانِ امام بخاری'' کی حیثیت سے پڑھاتے۔

۵-:اصل مصادر سے مراجعت کے اہتمام کی بنا پر آپ کی تحقیقات میں جو شوکت اور وزن ہوتا اس کو تمام سامعین اور مخاطبین صاف طور پر محسوس کرتے، کسی بھی حدیث کی شرح اور علل کے سلسلے میں، شراحِ حدیث اور ائمہ فن کے اقوال نقل کرنے کے بعد اُن میں محاکمہ اور ترجیح؛ آپ کے سبق کا روزانہ کا معمول تھا، خصوصاً حافظ الدنیا علامہ ابن حجر عسقلانیؒ کے ساتھ غایت درجہ ادب واحترام اور محبت وعقیدت کے باوجود، ان کے کلام پر استدراک وتعاقب کا انداز بڑا ہی وقیع اور دل نشین ہوتا۔

۶-:حدیث شریف کے مختلف الفاظ وطرق کی تحقیق وترتیب، پھر ان کے مابین (ظاہری) تعارض کے وقت جمع بین الروایات اور تطبیق بین المتعارضین آپ کا خصوصی ذوق تھا، جس میں آپ کے بڑوں نے بھی آپ سے استفادہ کیا ہے۔

۷-:خاص بخاری شریف کے درس میں ''تراجمِ بخاری'' کی تطبیق میں بھی آپ کو خصوصی ملکہ حاصل تھا، متقدمین ومتاخرین شراح واکابر کی آرا بیان کرنے کے بعد، اپنی فیصلہ کن رائے بہت مخصوص انداز میں پیش فرماتے، حتی کہ حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ نے اپنی کتاب ''الابواب والتراجم'' میں بھی آپ کی بعض آرا شامل فرمائی ہیں۔

علمی شہادت:-

۱-:آپ کے ان علمی کمالات کی شہادت اور ترقیات کی بشارت اصحاب نظر بزرگوں نے بہت پہلے ہی دے دی تھی، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب نے فرمایا تھا کہ ''ایک زمانہ آئے گا کہ تیرا کلام حجت ہوگا''۔

۲-:مولانا یوسف صاحب متالا مدظلہ نے ''مصباح القاری'' کے مقدمے میں سنہ ۱۳۸۷ھ کا ایک

عجیب وغریب واقعہ لکھا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ نے آپ کے ایک سعادت مندانہ طرزِ عمل سے خوش ہوکر آپ کوایک دستی خط لکھا، جس کا مضمون یہ تھا:

''ابھی کم سن ہیں وہ، کیا عشق کی باتیں جانیں عرضِ حالِ دلِ بے تاب کو شکوہ سمجھے

ابھی تدریسِ دورہ کا پہلا سال ہے، اور اِس سیہ کار کوتدریسِ دورہ کا اکتالیسواں سال ہے، اور تدریسِ حدیث کا سینتالیسواں سال ہے، اللہ تعالیٰ تمہاری عمر میں برکت دے، اور مبارک مشغلوں میں تادیر رکھے، جب سینتالیس پر پہنچ جاؤ گے توان شاء اللہ مجھ سے آگے ہوگے''۔فقط

زکریا ۲۷/رجب ۱۳۸۷ھ' انتہیٰ۔

اُس ملفوف مکتوبِ گرامی کے لفافے پر یہ تحریر تھا:

''اِس پرچے کونہایت احتیاط سے کسی کتاب (میں) رکھیں، چالیس سال کے بعد پڑھیں''۔

چنانچہ حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ کے دستِ مبارک سے لکھا ہوا وہ مبارک پرچہ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ نے اپنی کسی کتاب میں رکھ لیا تھا، چند سال قبل نکال کر پڑھا، گریہ طاری ہوگیا، اور فرمایا کہ اس خط سے مجھے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ اَب باذن اللہ تعالیٰ میں چالیس سال اور زندہ رہوں گا!!فللّٰہ دَرُّ أولیائہ وأصفیائہ!!۔

۳-: شیخ فرید الباجی حفظہ اللہ (جن کوخود حضرت الاستاذ ''حافظِ حدیث'' کہتے تھے، اُنھوں نے) فرمایا: اگرمیں نے کوئی محدث دیکھا ہے تو وہ صرف حضرت ہی کی ذاتِ گرامی ہے۔

۴-: اس کے علاوہ دیگر عرب اور عجم علماء اور اہل فن آپ کا ''امیر المؤمنین فی الحدیث'' اور ''امام المحدثین فی زماننا'' ہونا تسلیم کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص سے آپ کوگذشتہ سالہا سال سے ہر سال ہی حج اور عمرے کے سفر کی سعادت حاصل ہورہی تھی، وہاں آپ کے عرب تلامذہ اور مستفیدین کا ایک طویل سلسلہ تھا، جوفن حدیث میں استفادہ کرنے کے لیے آپ کا منتظر رہتا۔

اِسی طرح وقتاً فوقتاً عرب علماء، حضرت الاستاذؒ سے استفادے کے لیے یہاں مظاہر علوم بھی تشریف لاتے رہتے، جن میں تین نام مجھے اِس وقت مستحضر ہیں:

۱: شیخ صفوان بن عدنان الداودی الشامی ثم المدنی حفظہ اللہ، یہ ہمارے تخصص فی الحدیث کے سال میں تشریف لائے تھے، اور تقریباً انیس دن کے قیام میں آپ سے مکمل بخاری شریف پڑھی تھی، اور آئندہ سفر میں مسلم شریف پڑھنے کا عزم لے کر واپس گئے تھے، مگر اس کی نوبت نہیں آسکی۔

۲: شیخ فرید الباجی التونسی حفظہ اللہ، یہ بھی ہمارے تخصص فی الحدیث کے سال میں تشریف لائے

تھے، حضرتؒ سے بہت استفادہ کیا، اور تصوف میں بیعت بھی ہوئے، پھر دو سال قبل بھی تشریف لائے تھے، اور کئی روز قیام فرمایا۔

۳: شیخ حامد بن احمد بن اکرم البخاری المدنی حفظہ اللہ، یہ گذشتہ سال ہی تشریف لائے تھے، اور یہ فرمایا تھا کہ ہم نے حضرتؒ سے مدینہ منورہ میں بہت استفادہ کیا ہے، عرصے سے تمنا تھی کہ حضرت کے وطن جا کر بھی فیض حاصل کریں، اسی لیے یہاں حاضر ہوئے ہیں۔

مؤلفات:-

تصنیف وتالیف آپ کا موضوع نہیں تھا، البتہ تحریری سؤالات واستفسارات کے جوابات آپ بہت تحقیقی اور باحوالہ دیتے تھے، اِسی طرح بعض بعض مسائل میں اپنے مطالعے کا نچوڑ اور تحقیق کا خلاصہ محفوظ فرمالیا کرتے تھے، اِس طرح سے متعدد موضوعات اور اہم مسائل پر آپ کے اِفادات منضبط ہوگئے، مثلاً: جزء المعراج، جزء المحراب، ارشاد اللبیب، جزء حیاۃ الانبیاء، جزء عصمۃ الانبیاء، ارشاد القاصد الی ماتکرر فی البخاری باسناد واحد......وغیرہ، جن میں سے اکثر ''الیواقیت الغالیۃ'' (چار جلدوں)، ''نوادر الحدیث'' اور ''نوادر الفقہ'' کے مختلف مجموعوں میں شائع بھی ہو چکے ہیں، اسی طرح ''کتاب التوحید'' کے نام سے بخاری شریف کی آخری کتاب کی درسی تقریر بھی طبع ہو چکی ہے، نیز ''نبراس الساری الی ریاض البخاری'' کے نام سے آپ کی مکمل تقریر بخاری (عربی) کی اشاعت بھی شروع ہو چکی ہے، جس کی پہلی جلد منظر عام پر ابھی حال ہی میں آئی ہے۔

فکری رجحان:-

حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہ کی درسی تقریر اور دیگر علمی تحریروں میں، فقہی رنگ کے بجائے، محدثانہ رنگ غالب رہتا تھا، اِس لیے بعض مسائل اور بعض افکار میں آپ کے ہاں اہلِ ظاہر محدثین کی موافقت پائی جاتی ہے۔

اِس پہلو سے متعلق چند نکتے پیشِ نگاہ رہیں تو ہمارے اکابر دیوبند کا مذاق ومزاج اور دینی مدارس کا مسلکی رخ اور فکری رجحان سمجھنا آسان ہوجائے:

۱-: فقہی اختلافات:

اِس مسئلے کی بنیاد سمجھنے کے لیے دو باتیں پیشِ نظر رہنی ضروری ہیں:

الف: ایک یہ کہ ہمارے ہاں ''اُصولِ حدیث'' کے موضوع پر جو کتابیں رائج ہیں وہ سب مطلق اُصولِ حدیث نہیں ہیں، بلکہ اُن میں حضراتِ شافعیہ کے فقہی نقطۂ نظر کی بھی بھرپور آمیزش ہے، جب کہ

حضرات اَحناف کے فقہی ذوق کے اعتبار سے اُصولِ حدیث وہ ہیں جو امام محمدؒ کے مشہور شاگرد قاضی عیسی بن اَبانؒ کے واسطے سے حنفی ''اُصولِ فقہ'' کی کتابوں (بطورِ خاص: اُصولِ جصاص، اُصولِ بزدوی، اور اُصولِ سرخسی) میں ''کتاب السنۃ'' کے عنوان کے تحت ذکر کیے جاتے ہیں، اگر حدیث اور رُواتِ حدیث کا مرتبہ متعین کرنے کے سلسلے میں حنفیہ کے اُصول مستحضر ہوں تو بہت سے اِشکالات خود بخود ختم ہوجائیں۔

ب: دوسری اہم بات یہ کہ محدثین کرام تو اَحادیث کی صرف صحت وضعف کے اعتبار سے تقسیم کرکے، مدارِ حکم اسی پر رکھتے ہیں، کہ بحیثیتِ سند جو حدیث صحیح ہو وہ مطلقاً حجت ہے، اور جو ضعیف ہو اُس میں تفصیل ہے۔

جب کہ حضراتِ احناف کے ہاں قرآن کریم کے ساتھ ساتھ، حدیثِ متواتر، حدیثِ مشہور اور اِجماع کو (اُن کے قطعی الثبوت ہونے کی وجہ سے) بنیادی طور پر مدارِ اَحکام قرار دیا گیا ہے، اِسی طرح اِن بنیادی مآخذ سے شریعت کے چند اُصول مستنبط کرلیے گئے ہیں، جن کو ''قیاس الاصول'' (یا شواہد الاصول، یا اُصولِ شریعت) کہا جاتا ہے، جو کہ ''قیاسِ شرعی'' (رابع الادلۃ الشرعیۃ، یعنی تعدیہ علّت) سے الگ اصطلاح ہے۔

پھر اَخبارِ آحاد (جو کہ ظنی الثبوت ہوتی ہیں، اُن) میں سے حنفیہ وہ روایات قبول کرتے ہیں جو قرآن کریم، سنتِ متواترہ/مشہورہ، اِجماع اور قیاس الاصول کے مطابق ہو، یا کم از کم مخالف نہ ہو، لہٰذا جو حدیث اس کے مطابق نہیں ہوتی؛ تو اگر ممکن ہوسکا تو کوئی مناسب توجیہ وتاویل کرتے ہیں، ورنہ منسوخ، یا مرجوح مانتے ہیں، اس کے برعکس اگر روایت سنداً ضعیف بھی ہو، مگر ان بنیادی مآخذ کے مطابق ہو تو اُس کو قبول کرلیتے ہیں؛ چاہے ''قیاسِ شرعی'' کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

جیسے ''حدیثِ مصراۃ'': یہ ''الخراج بالضمان'' اور ''ممانعتِ ربوا'' وغیرہ اُصولِ مسلّمہ کے خلاف ہے، اِس لیے صحتِ سند کے باوجود اس کو قبول نہیں کرتے، یہی حال ''حدیثِ خیارِ مجلس''، ''حدیثِ قضاء بشاهد''، ''حدیثِ فقأ عین'' (کسی دوسرے کے گھر میں جھانکنے والے کی آنکھ پھوڑ دینے) وغیرہ کا ہے، اس کے برخلاف ''حدیث الوضوء بالقهقهة'': اگرچہ سنداً ضعیف ہے، اور ''قیاسِ شرعی'' کے خلاف بھی ہے، مگر ''قیاس الاصول'' کے خلاف نہیں ہے، اِس لیے حنفیہ کے ہاں اُس پر عمل ہے (کما حقق ذلک کله الشيخ عبد المجيد التركماني في كتابه الفذ الماتع النافع: ''دراسات في أصول الحديث عند الحنفية'')۔

اَب جو محدثین اس دقیق اور وقیع اُصول کو پیشِ نظر نہیں رکھتے ان کو بعض مرتبہ حنفیہ پر یہ اِشکال ہوتا ہے کہ

یہ حدیثِ صحیح کی مخالفت کر رہے ہیں، حالاں کہ وہ خبرِ واحد جو متواتر و مشہور ہو اور اُن سے ثابت شدہ ''قیاس الاصول'' کے خلاف ہو حنفیہ اس کو ''صحیح'' مانتے ہی نہیں، بلکہ دلیلِ اقوی کے مخالف مان کر شاذ اور منکر کہتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اِس تفصیل کے بعد مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ ہمارے حضرت الاستاذؒ کے ہاں حدیثی پہلو سے حنفیہ کے اوپر جو اِشکالات پائے جاتے تھے، اگر اس نقطۂ نظر سے اُن کو غور و خوض کا موضوع بنایا جاتا تو ممکن تھا کہ وہ مرتفع ہو جاتے، اور کم از کم یہ بات بہر حال متعین ہو جاتی کہ مسئلہ ''حدیث اور فہمِ حدیث'' کا ہے، ''رائے اور قیاس'' کا نہیں ہے۔

۲- تقلید و عدمِ تقلید:

اِس سلسلے میں مختلف قسم کے نظریات پائے جاتے ہیں:

۱: تقلیدِ جامد کا نظریہ: جس میں اُصولِ شریعت اور کتاب و سنت کے نصوص سے صرفِ نظر کر کے، صرف اور صرف شخصیات پیشِ نظر ہوتی ہیں، الحمد للہ ہمارے اکابرِ دیوبند کے ہاں کبھی بھی یہ طریقہ نہیں رہا ہے، البتہ جو عوام الناس دینی علوم اور کتاب و سنت سے ثابت شدہ شرعی اُصول سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں، وہ جب تک مطلوبہ علم حاصل نہ کرلیں؛ اہلِ باطل کی تلبیسات و تشکیکات سے بچانے کے لیے اُنھیں اسی تقلید کا مشورہ دیا جاتا ہے۔

۲: تحقیقی تقلید کا نظریہ: یہی ہمارے اکابر کا مسلک ہے، جس میں اصل بنیاد تو کتاب و سنت کے نصوص اور ان سے ثابت شدہ اُصول ہوتے ہیں، مگر اُن میں راجح مرجوح، ناسخ منسوخ وغیرہ کا فیصلہ کرنے، اور پھر راجح اور ناسخ کے سمجھنے میں اپنے فہم سے زیادہ، بحیثیتِ مجموعی سلفِ صالحین کے فہم پر اعتماد کیا جاتا ہے، اور ''اتباعِ ہوی'' سے بچنے کے لیے کسی متعین امام کی تقلید کو (انتظاماً) ضروری قرار دیا جاتا ہے، گویا نصوصِ شریعت کے فہم اور علمائے شریعت پر اعتماد کے درمیان اعتدال و توازن رکھا جاتا ہے۔

اِس تقلید میں سب سے بنیادی اُصول یہ ہے کہ اجتہادی مسائل میں اپنے امام کے قول کو حق سمجھا جائے؛ احتمالِ خطا کے ساتھ، اور دوسرے اہلِ حق علماء کے اَقوال کو خطا سمجھا جائے؛ احتمالِ صواب کے ساتھ، اور جب تک کسی کے بارے میں دلائل یا واضح قرائن سے اِتباعِ ہوی اور مخالفتِ سنت ثابت نہ ہو جائے، اُس کو گمراہ نہ کہا جائے، تو اس طرح سے یہ اجتہادی اختلافات امت میں تفریق کا باعث نہیں بنیں گے۔

۳: اتباعِ سلف کا نظریہ: اس میں کسی متعین امام کی پابندی نہیں ہوتی، جس مسئلہ میں جس امام کا قول اپنے فہم و ذوق کے اعتبار سے اَقوی اور اَقرب الی السنۃ سمجھ میں آتا ہے، اس کو اختیار کر لیا جاتا ہے، حافظ ابن حزمؒ، علامہ ابن تیمیہؒ وغیرہ بہت سے وہ اہلِ علم جن کے ہاں علمی غلغلہ اور تحقیقی جوش رہا ہے، اُنھوں نے یہی مسلک اِختیار فرمایا ہے، ہمارے حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کا بھی یہی مسلک تھا۔

اگر کسی محقق عالم کو کسی مسئلے میں کسی اور جانب شرح صدر ہو جائے تو فی نفسہ اس کے لیے ذاتی طور پر اُس مسئلے میں عدول عن المسلک جائز ہے، مگر دو شرطیں ہیں: ایک یہ کہ دیگر ائمہ اور ان کے متبعین کے بارے میں کم علمی، اور مخالفتِ سنت کا الزام دے کر، تشویش نہ پیدا کرے، دوسرے عوام کے سامنے اپنے تفردات کا اظہار نہ کرے، تاکہ وہ علماء سے بے اعتمادی کا شکار نہ ہوں (کما أفاده حکیم الأمة التهانوي رحمه الله)۔

۴**:مسلکِ سلفیت:** اس کی بنیاد تحقیق حق اور اُس کے اتباع پر نہیں ہے، بلکہ یہ ایک نظریاتی جماعت ہے، اس میں کسی قول کو اختیار کرنے، یا ترک کرنے کے لیے علمی بحث نہیں کی جاتی، بلکہ جماعتی اور تقلیدی بنیادوں پر: حق کو اپنے دائرے میں محدود مان کر، تقلید، تصوف اور اشعریت وغیرہ کو علی الاطلاق گمراہی (یا کفر) قرار دیا جاتا ہے، ان کے نزدیک امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ سے لے کر، خطیب بغدادیؒ، ابن الصلاحؒ، نوویؒ، ابن حجرؒ، عینیؒ وغیرہم تمام اکابر فقہاء و محدثین اور اساطین علم سب کے سب (علمی یا فکری) گمراہی کا شکار رہے ہیں، امام احمدؒ کا جس سے بھی اجتہادی، یا غیر اجتہادی اختلاف ہوا، سب کو گمراہ اور بدعتی سمجھا جاتا ہے، اسی لیے یہ لوگ (اُمت کے چودہ سو سالہ معمول کے خلاف) حکومتی اور عوامی سطح پر باقاعدہ طور پر اپنے مسلک کی ترویج، تبلیغ اور اشاعت کے لیے جائز و ناجائز ہر طرح کے پروپیگنڈے اور ہتھکنڈے اختیار کرتے ہیں۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ میرے حضرت شیخ اس جماعت اور اس کے فتنہ انگیز طرزِ عمل سے اظہارِ برأت فرماتے تھے، اور ان کو ''غیر مقلدین'' کہتے تھے۔

۵**:حریتِ فکر اور آزادیٔ رائے:** اِس فکر کا تعلق اہلِ حق کے فکر و مزاج سے نہیں ہے، بلکہ مغرب زدہ نیچرلزم (فطرت پرستی) اور ریشنلزم (عقل پرستی/ اعتزال) سے متاثر طبقات اور افراد دینی اَحکام کو اہلِ حق علماء کی تقلید کے بجائے، مغرب کے وضع کردہ سائنٹیفک اصولوں پر پرکھتے ہیں، اور عقائد و اَحکام میں کتاب و سنت کے غیر مشروط اِتباع کے بجائے نصوص کو اپنے ذوق و عقل کے تابع کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ قدیم معتزلہ سے زیادہ بے اعتدالی کا شکار ہیں۔

حضرت الاستاذؒ اس فکر کو بھی گمراہی اور ضلالت سمجھتے تھے، ہمارے تائے ابا حضرت مفتی عبد القدوس رومی صاحبؒ نے ''آزاد مفسرین'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا (جو ''آئینۂ مظاہر علوم، وقف میں چند قسطوں میں شائع ہوا تھا)، جس میں سرسید، ابوالکلام آزاد، اور مودودی صاحب وغیرہم کے تفسیری انحرافات سے متعلق اُصولی بحث کی گئی تھی، یہ بات کم ہی حضرات کے علم میں ہوگی کہ وہ مضمون حضرت شیخ ہی کی تحریک اور فرمائش پر لکھا گیا تھا۔

البتہ یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ حریتِ فکر، آزادیٔ رائے (فطرت پرستی اور اعتزال) کا یہ

انحراف علامہ شبلی نعمانی کے ہاں بھی پایا جاتا ہے، جیسا کہ جابجا ان کی تحریروں میں اس کے نمونے موجود ہیں، اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ وغیرہ محققین علماء نے اس کی صراحت بھی کی ہے، مگر غالباً حضرت شیخ کے سامنے علامہ کی وہ تمام چیزیں تھیں نہیں، اس لیے ''سیرۃ النبی'' کے پر زور اسلوب، پر شوکت تعبیرات اور پرکشش اندازِ بیان سے متاثر ہوکر، معجزات اور مغیبات کے سلسلے میں علامہ شبلی کے انحرافات پر تنبیہ اور ان کی تعیین کے بغیر، آپ ان کی تحسین وتوصیف فرماتے تھے، جس سے بعض مرتبہ نوخیز اذہان علامہ سے مرعوب ومتاثر ہوجاتے تھے۔

۳-:صفاتِ باری تعالیٰ:

اِس مسئلے میں اَشاعرہ وماتریدیہ کے ہاں تاویل کا جو مذہب ہے اُس پر اہلِ ظاہر کو بہت اِشکال رہتا ہے، مگر یہاں یہ وضاحت اہم ہے کہ:

صفات وغیرہ سے متعلق نصوص میں سلفِ صالحین کا مسلک ''تفویض مع التنزیہ'' کا ہے، جس کا حاصل ہے کہ جو نص جس طرح سے وارد ہو اس کو پڑھ کر، خاموشی سے گذر جایا جائے، اور اُس کے معنی ومطلب میں غور وخوض نہ کیا جائے: ''تؤمن به و تمرّہ کما جائ'' جیسا کہ امام ترمذی نے حدیث: ۲۵۵۷ کے تحت فرمایا ہے: تؤمن به كما جائ من غير أن يفسّر أو يتوهم، هكذا قال غير واحد من الأئمة: الثوري ومالک بن أنس وابن عيينة وابن المبارک، إنه تروى هذه الأشياء ويؤمن بها، ولا يقال كيف۔ انتهى ۔ گویا کہ یہ سلفِ صالحین کے ہاں متشابہات میں سے ہیں (كما حققه الشيخ سيف بن علي العصري في كتابه النافع الماتع: ''القول التمام بإثبات التفويض مذهباً للسلف الكرام'')۔

مگر علامہ ابن تیمیہؒ اور ان کے متبعین کو سلف کے اِس مسلک سے اِختلاف ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ''تفویض'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس پڑھ کر گذر جاؤ، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے لیے ''وجہ''، ''ید''، ''رِجل''، ''جہتِ علو'' وغیرہ صفات کا اِثبات کرو، مگر مخلوق پر قیاس کر کے نہیں، بلکہ اُس کے شایانِ شان۔

ہمارے حضرت شیخ نے اپنا جو مسلک ''کتاب التوحید'' (مطبوعہ) میں بیان فرمایا ہے، وہ تو سلف کے مسلک کے مطابق ہے، بلکہ فی الجملہ اس میں علامہ ابن تیمیہ پر تعریض بھی ہے، مگر آپ کا جو مسلک بعض سوانح نگاروں نے نقل کیا ہے وہ علامہ ابن تیمیہؒ والا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

لیکن علامہؒ کے اِس مسلک سے عوام الناس کے، تشبیہ وتجسیم میں پڑ جانے کا بہت خطرہ رہتا ہے، جو کہ یقیناً ایک کھلی ہوئی گمراہی ہے، کیوں کہ ''وجہ'' و ''ید'' وغیرہ کے اِثبات کے بعد ذہن اُس کے مجسم تصور کی طرف بھی جاتا ہے، اِس لیے ہمارے اکابر دیوبند فرماتے ہیں کہ یا تو سلف والی ''تفویض مع التنزیہ'' کا مسلک اختیار کیا جائے، کہ پڑھ کر گذر جایا جائے (اور حضرت تھانویؒ نے اسی کو احوط اور اَولیٰ قرار دیا ہے)۔

یا اَشاعرہ وماتریدیہ والی توجیہ وتاویل کا مذہب اختیار کیا جائے، تا کہ تجسیم وتشبیہ میں پڑنے کا خطرہ نہ رہ جائے، اور جہاں تک ''تاویل'' کی بات ہے تو اُس سے مفر ان اہل ظاہر کو بھی نہیں قرآن کریم میں {وهو معكم أين ما كنتم}، اور حدیث شریف میں ''إنّ ربه بينه و بين القبلة '' کے مضمون کی کتنی ہی نصوص ایسی ہیں جن کی علامہؒ اوران کے متبعین کو بھی تاویل کرنی پڑتی ہے۔

۴- تصوف اور صوفیہ:

الف: تزکیہ واحسان میں بنیادی طور پر اصل مقصود جو اُمور ہیں وہ ہیں: اِخلاص وللّٰہیت، خشوع وخضوع، خوف وخشیت، رجوع وانابت، تواضع وعبدیت، تقوی وطہارت، زہد واِستغنا، اور ذکر وفکر، پھر یہ اصطلاحات ایسی ہیں جو ماثور ومنقول بھی ہیں، اور عام لوگوں کے لیے مانوس اور قابلِ قبول بھی، اِس لیے سلف سے لے کر خلف تک تمام صالحین نے اِن اُمور کو مقصود بنا کر پہلے اپنی، پھر خلقِ خدا کی اِصلاح وتربیت کی فکر اور کوشش فرمائی۔

اِس حیثیت سے ہمارے حضرت الاستاذؒ بھی تزکیہ واِحسان سے وابستہ، بیعت وخلافت کے سلسلے سے منسلک، مسند اِرشاد پر فائز، ایک صاحبِ سلسلہ بزرگ، ایک صاحبِ حلقہ شیخ، اور ایک باکرامت وبا استقامت صوفی تھے، جن سے ہزاروں لوگ عملی استفادہ، اور روحانی استفاضہ میں مشغول رہتے تھے۔

مگر ''تصوف وسلوک'' اور ''صوفیہ'' کی اصطلاح: دورِ صحابہؓ میں نہیں پائی جاتی، پھر فن تصوف کے اندر مزید جو نامانوس اصطلاحات ہیں اُن سے اُن لوگوں کو اور وحشت ہوجاتی ہے جو ہر چیز کو صرف ظاہری پیمانے سے ناپنے کے عادی ہوتے ہیں، اِسی لیے علامہ ابن تیمیہؒ اوران کے متبعین کے ہاں اس مسئلے میں بھی کافی شدت پائی جاتی ہے، اور یہ حضرات ''وحدۃ الوجود''...... جیسی (محض قالی کے بجائے، حالی) اِصطلاح کو کفر والحاد سے تعبیر کرتے ہیں! اوران کے قائلین کو کافر اور ملحد کہتے ہیں!!

اگر نیت درست ہو، اِصلاح وتزکیہ کی ضرورت کا اِنکار نہ ہو، ذاتی طور پر تقوی وطہارت اور صلاح وتدین حاصل ہو، تو ظاہر شریعت کی حفاظت کے پہلو سے یہ مسلک بھی فی الجملہ قابل قبول ہوسکتا ہے، اور یہی ہمارے حضرت شیخ کا حال تھا۔

مگر اکابر دیوبند کا اِس باب میں مذہب یہ ہے کہ اصطلاحات کا تعلق تو فن سے ہوتا ہے، جیسے حدیث اور فقہ کی اصطلاحات دورِ صحابہؓ میں نہیں تھیں، مگر جب یہ علوم فن کی شکل میں مدوّن ہوئے تو اِفہام وتفہیم کے لیے اصطلاحات کا سہارا لینا پڑا، اسی طرح جو اِصلاح وتزکیہ شریعت میں روزِ اول سے فرض کیا گیا ہے، اُس کو جب بطورِ فن کے مدون کیا جانے لگا تو اس کے لیے بھی اصطلاحات وضع کرلی گئیں، ولا مشاحة في الاصطلاح۔

پھر تصوف ایسا میدان ہے جو ذہنی ورزش اور ظاہری قیل وقال کے بجائے، از اول تا آخر صحرا نوردی

(سلوک) سے تعلق رکھتا ہے، اِس لیے اُس کے مشتغل کو دورانِ سلوک غیر اختیاری طور پر (قبض، بسط، فرح، وجد وغیرہ) مختلف حالات وکیفیات سے گذرنا پڑتا ہے، اِس لیے اس میں ہر سالک اور ہر طالب کے احوال کے اعتبار سے اصطلاحات میں مزید تنوّع اور کثرت کی صورت ہوگئی ہے۔

ب: اور جہاں تک بات صوفیائے کرام کی ہے، اُن کے بارے میں اکابرِ دیوبند کی فکر کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنے اکثر اَحوال میں متبعِ سنت اور پابندِ شریعت ہوں، دین اور دینی اَحکام وشعائر کا احترام کرتے ہوں، اور خصوصاً متبعینِ سنت بزرگوں اور محققین اہلِ علم کا اُن کے بارے میں حسنِ ظن کا معاملہ ہو، تو اُن کے ساتھ حسنِ ظن ہی رکھا جائے، اَب اگر کہیں اُن سے کوئی قول یا عمل خلافِ شریعت سامنے آئے تو اگر ممکن ہو تو اس کی مناسب توجیہ کرلی جائے، ورنہ صرف اُس قول یا عمل کو (جس کو ”شطحات“ کہتے ہیں) ردّ کردیا جائے، شخصیت ہی کو مطعون ومجروح نہ قرار دے دیا جائے، ورنہ ہمارا چودہ سو سالہ دینی سلسلہ ہی منقطع اور مخدوش ہوجائے گا، کیوں کہ دو چار علماء کو چھوڑ کر، گذشتہ دس صدیوں میں شاید ہی کوئی ایسا قابلِ ذکر عالم ومحدث ہو جو عقائد میں اشعری یا ماتریدی نہ ہو، فقہ میں مقلد نہ ہو، اور سلسلۂ تصوف سے عملی طور پر وابستہ نہ ہو۔

شیخ محی الدین ابن عربیؒ، مولانا رومؒ، حافظ شیرازیؒ وغیرہم کے ساتھ اکابرِ دیوبند کا یہی معاملہ ہے، کہ ان کی شخصیات کو مطعون ومجروح نہیں کرتے، ہاں اُن کے جو اَقوال واَحوال ظاہرِ شریعت کے خلاف سامنے آتے ہیں؛ تو اگر تاویل ممکن ہوئی تاویل کرلیتے ہیں، ورنہ اُن باتوں کو ردّ کردیتے ہیں۔

اکابرِ دیوبند کا اِن صوفیائے کرام کی طرف سے تاویل وتوجیہ کرنا، اور اس کے برخلاف آزاد فکر (نیچری) لوگوں کو ضال، مضل اور ملحد وگمراہ وغیرہ قرار دینا؛ ان دونوں کے درمیان بڑا فرق یہ ہے کہ آزاد فکروں کے ہاں دین، اَحکامِ دین اور شعائرِ دین کی عظمت نہیں ہوتی، بلکہ بعض مرتبہ طنز وتعریض اور استخفاف واستہزاء کی صورت ہوجاتی ہے، جب کہ صوفیائے کرام سراپا اَدب وتعظیم ہوتے ہیں، اور جو کچھ اُن سے بے اعتدالیاں ہوتی ہیں وہ کم علمی، کم فہمی یا غلبۂ حال میں ہوتی ہیں، وشتان ما بینھما۔

اگر کسی طالبِ حق کو (فقہی اختلاف، تقلید، عقائد اور تصوف سے متعلق) یہ چاروں اُصول مستحضر ہوں تو اُس کے لیے ”فکرِ دیوبند“ کا خلاصہ سمجھنا، اور اکابرِ دیوبند پر کیے جانے والے اعتراضات سے بچنا بہت آسان ہے۔ واللہ الموفق، وھو المستعان، ولا حول ولا قوۃ إلا باللہ العلي العظیم۔

بہر حال یہ بات تو طے ہے کہ ہمارے حضرت شیخ رحمہ اللہ کے ہاں جو علمی وفکری تفردات پائے جاتے

ہیں اُن کا منشا وہی تحقیقی جوش اور علمی غلغلہ تھا، جو علامہ ابن تیمیہؒ جیسے آحادِ اُمت کے ہاں بکثرت، اور علامہ ابن الہمامؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، اور علامہ عبدالحئ فرنگی محلیؒ جیسے اکابر کے ہاں جزوی طور پر پایا جاتا ہے، خدانخواستہ اِس کا منشا آزادیٔ رائے اور حریت فکر وغیرہ نہ تھا۔

نصائح:-

آخر میں ایک طالب علم کے نام حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کے مکتوبِ گرامی سے چند نصائح نقل کی جاتی ہیں:

(۱) تصحیح نیت اور اِخلاص کا اہتمام

(۲) اتباعِ سنت پر مداومت

(۳) معاصی سے کلی اجتناب اور مواقعِ معاصی سے حتی الوسع دوری

(۴) تعلیمِ دین سے اشتغال اور اشاعتِ دین کی مکمل فکر

(۵) تبلیغ سے حتی الوسع ربط

(۶) تزکیہ واِصلاح کی غرض سے اہل اللہ سے تعلق اور ان کی ہدایت پر عمل

(۷) اِصلاح فیما بین المسلمین کا اہتمام اور منازعت سے کلی گریز (اکثر جھگڑا کرنے والا علم سے محروم رہ جاتا ہے)۔

(۸) قدرے نوافل کا اہتمام

(۹) اپنے اندر اللہ پاک کی محبت پیدا کرنے کی فکر

کسی اور موقع پر اس طرح کی بھی نصائح فرمائیں:

(۱۰) جب اللہ تعالیٰ تنگی دے تو صبر کرے، اور جب وسعت دے تو خرچ کرے۔

(۱۱) اگر دنیا کے لیے پڑھے تو علم یہاں بھی وبال ہے اور آخرت میں بھی، اس لیے بچو اپنی نیت صحیح کرو۔

(۱۲) درود شریف میں بے انتہا فوائد وانعامات ہیں۔

اللہ تعالیٰ حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہ کی بال بال مغفرت فرمائیں، میرے اوپر حضرت کے جو علمی وتربیتی اِحسانات ہیں (جس کی تفصیل اِن شاء اللہ پھر کسی مجلس میں عرض کی جائے گی) اُن اِحسانات کا اپنے شایانِ شان بدلہ عنایت فرمائیں، حضرت کے فیوض وبرکات اور علوم ومعارف سے ہم سب کو بھرپور استفادہ کی توفیق عطا

فرمائیں، اور امت کو خصوصاً جامعہ مظاہر علوم کو حضرت کا نعم البدل عطا فرمائیں، وما ذلک علی اللہ بعزیز ۔

اللّٰھم اغفر لہ، وارحمہ، وعافہ، واعف عنہ، وأکرم نزلہ، ووسع مدخلہ، واغسلہ بالماء والثلج والبرد، ونقہ من الخطایا کما ینقی الثوب الأبیض من الدنس، وأبدلہ دارا خیرا من دارہ، وأھلا خیرا من أھلہ، وقہ عذاب القبر وعذاب النار۔ آمین۔ وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ محمد وآلہ وأصحابہ أجمعین، وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔

[**ضروری وضاحت:** احقر کا یہ مضمون اور بھی بعض رسالوں میں شائع ہوا ہے، مگر ادارہ ''شاہراہ علم'' (اکل کوا، مہاراشٹر) کی طرف سے مضمون کے لیے فرمائش موصول ہونے پر، اسی پر نظر ثانی کر کے کچھ ضروری ترمیم وتصرف اور ردو بدل کیا گیا ہے، اب ۔بظاہر۔ یہ اپنی آخری شکل میں ہے۔

محمد معاویہ: ۲۵/ ذی قعدہ ۱۴۳۸ھ مطابق ۱۸/ اگست ۲۰۱۷ء]

... ...